ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک*

تصور خودی اور مفکر اسلام ابن القیمؒ**

شام ہمدرد کی ان مجالس میں ایک عرصے سے خودی اور فلسفہ خودی کی عالمانہ تشریح اور توضیح کی جا رہی ہے۔ اقبال اور فلسفہ اقبال کے متخصصین کی ایک کثیر تعداد اس موضوع پر اظہار خیال کر چکی ہے۔ لہذا میں خودی کی تعریف و تشریح، اس کے سلسلہ عمل، اس کے استحکام ضعف اور انفرادی اور اجتماعی خودی وغیرہ موضوعات پر گفتگو سے گریز کروں گا۔ کیونکہ یہ گفتگو تحصیل حاصل ہوگی۔ یہ خالص علمی بحثیں خاصی دقیق، مشکل اور طویل ہیں اور آج کی مجلس میں ان کے لیے گنجائش بھی نہیں۔

تاہم میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خودی، خود داری، خود شناسی، خود اعتمادی، احساس کہتری سے نجات اور اپنے آپ پر بھروسے اور خود اپنی قوتوں سے کام لینے کا دوسرا نام ہے۔ خودی غرور و تکبر نہیں اپنی ذات کی پہچان اور اس کی تکمیل ہے۔ آج کل کی نفسیات کی اصطلاح میں Ego یا شخصیت کا جو مفہوم ہے خودی اس کے بہت قریب ہے۔ عربی میں اس تصور کو انا کہتے ہیں۔

قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنی ان صلاحیتوں کا پتہ لگائیں جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہیں، ان سے آشنائی اور آگاہی حاصل کریں، انھیں پردہ خفا سے معرض شہود میں لائیں اور اس طرح ان کی اور درحقیقت اپنی ترقی و ارتقاء کا سامان کریں۔ یہ دنیائے رنگ و بو اور عالم کون و مکان خودی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے اور خودی کی بدولت ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ دنیا میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے سب خودی کا کرشمہ اور اس کی قدرتوں کا اظہار ہے۔ خودی کو پانا اور اس کی نشو و نما کرنا گویا اپنی شخصیت کو پانا اور اس کی نشو و نما کرنا ہے۔

آٹھویں صدی کے بے مثال عالم اور امام ابن تیمیہؒ کے معروف ترین شاگرد امام ابن قیم الجوزیہ نے اپنے دور میں اسی تصور کی تربیت و تعمیر اور استحکام کے سلسلے میں جسے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے خودی کا نام دیا۔ عدیم النظیر خدمات

---

* رئیس کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ و پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

**یہ مقالہ شام ہمدرد کی ایک تقریب میں پڑھا گیا۔

انجام دی ہیں ۔ اسی سلسلے میں اُن کی خدمات کا جائزہ لینے اور اُن کی اصلاحی جد و جہد اور اُن کے علمی و اصلاحی مزاج کو سمجھنے کے لیے اُس ماحول سے آگہی حاصل کرنا ضروری ہے جس میں وہ پیدا ہوئے ، نشو و نما پائی اور جس میں بعد میں انھوں نے اپنا اصلاحی و تجدیدی کام سر انجام دیا ۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری تاریخ اسلام میں ایک انتہائی نازک اور پرفتن دور تھا ۔ سیاسی ، اجتماعی ، اخلاقی ، علمی اور دینی حیثیت سے یہ دور خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ سیاسی اعتبار سے اس دور میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا کے ہر خطے میں بہت چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے مابین ہر طرح کا تعاون مفقود تھا ۔ وہ ایک دوسرے کی طرف محبت کرنے والے مسلمان بھائی کی طرح نہیں بلکہ تاک میں رہنے والے دشمن کی طرح دیکھتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ۔ مسلمان ملوک و سلاطین نے اپنی رعایا کو جبر و استبداد کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا ۔ ابن الاثیر اپنی تاریخ الکامل میں شروع ساتویں ہجری کے سیاسی حالات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں :

''ان ایام میں مسلمانوں کو اور اسلام کو ایسے ابتلاء سے دوچار ہونا پڑا جس سے کسی دوسری قوم کو سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ ان بلاؤں میں ایک تو تاتاری تھے جو مشرق سے ٹڈی دل کی طرح امڈے اور ایسے افعال کا ارتکاب کیا کہ جن کو سن کر انسان کانپ اٹھتا ہے ۔ دوسری بلا فرنگیوں کی تھی جو مغرب سے آئے اور شام کی طرف بڑھے ۔ مصر کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی اور دمیاط پر قابض ہوئے ۔ یہاں سے وہ مصر پر چھا جانا چاہتے تھے مگر اللہ تعالی نے مسلمانوں کی امداد کی اور اُن کے زور کو توڑ ڈالا'' ۔

یہ اُس شخص کی رائے ہے جس نے عالم اسلام پر نازل ہونے والی ان بلاؤں کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں پر تین اطراف سے یورش ہوئی ۔ مشرق سے تاتاریوں نے حملہ کیا ، مغرب سے صلیبی بڑھے اور داخلی طور پر مسلمان امراء کی باہمی رزم آرائی نے حالات مزید ابتر کر دیے ۔ پھر وہ وہی تھے جو ہر دم دشمن کے آلہ کار بنے ہوئے تھے اور وہ مسلمان فرقے ہی تھے جو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے مگر بت پرست تاتاریوں کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے ۔

عیسائیوں میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے اور اسلام پر اعتراضات کرنے کی ایک نئی تحریک پیدا ہو چکی تھی ۔ صلیبیوں کے پے در پے حملوں اور

شام و فلسطین و قبرص میں مغربی النسل عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی موجودگی نے آن میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے مقابلہ کریں اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات اور اپنے مذہب کی ترجیح پر کتابیں تصنیف کریں ۔

ان عیسائی مناظرین و مصنفین کے حملوں سے زیادہ خطرناک حملہ ایک اسلامی فرقے باطنیہ کا تھا جو ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی مدد کرتے تھے اور اکثر آن کی تحریک پر اسلامی ممالک پر بیرونی حملے ہوئے ۔ صلیبیوں اور تاتاریوں کے حملوں کے دوران انھوں نے کھل کر آن کا ساتھ دیا ۔ مسلمانوں کے دفاعی راز دشمن تک پہنچائے اور آن کے لیے اسلامی قلعوں کے دروازے کھولے ۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں ذہنی انتشار ، دین سے بے اعتمادی اور بغاوت پھیلانے اور الحاد اور بے دینی کی اشاعت میں منہمک رہے ۔

سیاسی حالات کی طرح اس دور کے دینی و مذہبی حالات بھی نا گفتہ بہ تھے ۔ مسلمان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھائے ہوئے توحید خالص کے سبق کو فراموش کر چکے تھے ۔ ان میں غیر مسلموں کے اختلاط ، عجمی اثرات اور علماء کے تساہل و غفلت کے سبب مشرکانہ عقائد و اعمال پھیل چکے تھے ۔ توحید و دین خالص پر پردے پڑتے جا رہے تھے ۔ اولیاء و صالحین کے بارے میں یہود و نصاریٰ کا سا غلو پیدا ہو چکا تھا ۔ انبیاء و صالحین کی قبور کے پاس وہ سب کچھ ہونے لگا تھا جس کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدشہ تھا اور جس سے پوری شدت سے آپ نے منع فرمایا تھا ۔ مسلمان غیر مسلموں اور ذمیوں کی رسوم و عادات اختیار کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے ۔ دوسری طرف تصوف بھی عروج پر تھا ۔ اس میں بہت سے غیر اسلامی افکار و عناصر شامل ہوگئے تھے اور بہت سے پیشہ ور جاہل ، غیر محقق اور مبتدع اس گروہ میں شامل ہو کر خواص و عوام کی گمراہی اور شرک و بدعات کی گرم بازاری کا سبب بن رہے تھے ۔ افلاطونیت جدیدہ کی اشراقیت ، ہندوستان کا جوگ ، حلول و اتحاد کا عقیدہ ، وحدۃ الوجود کا مسلک ، ظاہر و باطن کی حد بندی رموز و اسرار اور علوم سینہ کا فتنہ ، کاملین و واصلین سے تکالیف شرعیہ کا سقوط اور احکام شریعت سے استثناء یہ سب وہ عقائد تھے جو اہل تصوف کے ایک بڑے حلقے میں مقبول و مسلم تھے اور اسلامی عقائد و افکار کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہوگئے تھے کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا ۔

اگرچہ ہر زمانے کے محققین اور راسخین فی العلم ان عقائد کی تردید و انکار کرتے تھے ، مگر صوفیاء کے ایک بڑے حلقے کو اس پر اب بھی اصرار تھا ۔

علمی و درسی حلقوں میں صدیوں سے ایک ایسا جمود تھا کہ اپنے گروہ کے فقہی دائرہ سے سرمو قدم نکالنا جرم سمجھا جاتا تھا ۔ فقہی اختلافات میں قرآن و حدیث کو حکم بنانے کی بجائے قرآن و حدیث کو ہر حال میں ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ۔ ہر مذہب کے پیرو اپنے فقہی مسلک کو تمام مذاہب فقہیہ سے افضل و اعلیٰ اور مقبول و موید من اللہ سمجھتے ۔ ان کی تمام ذہانت ، قوت تصنیف، قوت بیانیہ اس کی ترجیح اور فضیلت ثابت کرنے میں صرف ہوتی تھی ۔ ترجیح و اختیارات فقیہہ کا دروازہ بھی عملاً بند تھا ۔ زمانے اور حالات کے تغیر کے ساتھ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو چکے تھے جن میں فتویٰ دینے کے لیے اسلام کے پورے فقہی ذخیرہ پر وسیع نظر ، کتاب و سنت پر عبور اور اصول فقہ سے گہری واقفیت ضروری تھی لیکن عرصہ سے علم و نظر اور مطالعہ محدود ہوتا چلا جا رہا تھا ۔ قوائے فکریہ مضمحل ہو رہے تھے اور کوئی عالم عرصہ سے نئے مسائل کے استنباط کی جرأت نہیں کر رہا تھا ۔ نتیجتاً اسلامی قانون اور فقہ اپنا نمو اور ارتقاء کی صلاحیت کھو چکے تھے اور قدیم فقہی ذخیرے میں اضافہ ناممکن سمجھا جانے لگا تھا ۔

اس فقہی گروہ بندی کے ساتھ ساتھ کلامی تعصب بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا مذاہب اربعہ کے پیرو ایک دوسرے کے معترف اور شاگرد استاد بھی تھے ۔ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے لیکن اشاعرہ و حنابلہ کا اتحاد تقریباً ناممکن تھا ۔ مذاہب میں بحث صرف ارجحیت و اولیت کی تھی یہاں بحث کفر و اسلام کی تھی ۔ ایک کو دوسرے کی گمراہی پر اصرار تھا ۔ عقائد کی بحثوں اور متکلمانہ موشگافیوں نے تمام مباحث کو دبا لیا تھا ۔

امام ابن قیم الجوزیہؒ نے اُن مایوس کن حالات میں آنکھ کھولی ۔ لیکن ابن القیم کی خوش بختی تھی کہ ان پرآشوب اور غیر مساعد حالات میں تجدید و حیائے امت کا کام اُس دور کے عظیم ترین عالم با عمل امام ابن تیمیہ کے سپرد کیا گیا جو وقت کی ہر طلب کا جواب تھے جو ایک ایسے مرد کامل تھے جو زندگی کے تمام میدانوں کے مجاہد تھے اور جن کی جد و جہد اور اصلاحات زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہ تھیں ۔ انہوں نے عالم اسلام میں ایک ایسی علمی و عملی حرکت اور زندگی پیدا کر دی جس کے اثرات صدیاں گزرنے کے بعد بھی محسوس کیے جا رہے ہیں ۔ امام ابن قیم الجوزیہ ابن تیمیہ کے عزیز ترین شاگرد اور اُن کی علمی میراث کے وارث تھے ۔ ابن تیمیہ کے بعد اُن کی تحریک اصلاح و احیاء امت کے سب سے اہم نمائندے تھے ۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد اُن کی کتب اور علوم کی نشر و اشاعت میں سب سے اہم خدمت ابن القیم نے ہی انجام دی ۔

اس موقع پر اختصار کے ساتھ ابن القیم کے حالات زندگی کا تذکرہ ضروری

سمجھتا ہوں تا کہ خودی ، خود شناسی اور حریت فکر کے احیاء و استحکام کے سلسلے میں اُن کی خدمات کے سمجھنے میں ہمارے مد و معاون ثابت ہو سکیں ۔

آپ کا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب الذرعی ہے ۔ آپ کے والد مدرسۃ الجوزیۃ کے قیم تھے ۔ اس بنا پر ابن قیم الجوزیہ اور پھر اختصاراً ابن القیم کے نام سے مشہور ہوئے ۔ سن ولادت ۶۹۱ھ اور سن وفات ۷۵۱ھ ہے ۔

آپ کے اساتذہ کی فہرست میں قاضی تقی الدین سلیمان ، ابوبکر بن عبدائم ، اسماعیل بن مکتوم ، علی بن الفتح ، المجد التونسی ، ابن الشیرازی ، فاطمہ بنت جوھر ، صفی الھندی اور ابن تیمیہ کے اسماء شامل تھے ۔ ابن القیم کے یہ سارے استاد آسمان علم کے درخشندہ ستارے تھے اور اپنے اپنے فن میں انھیں کمال حاصل تھا لیکن آپ اپنے جملہ اساتذہ میں سے ابن تیمیہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ۔ ابن تیمیہ کے ساتھ آپ کو بے پناہ عقیدت و محبت تھی ۔ ۷۲۱ھ سے لے کر جب کہ ابن تیمیہ مصر سے مراجعت فرما کر دمشق میں مقیم ہوئے ، ۷۲۸ھ تک جب کہ امام ابن تیمیہ نے وفات پائی ایک لمحہ کے لیے بھی آن سے جدا نہ ہوئے ۔ آن کا رنگ آپ پر غالب تھا ۔ اپنی جملہ تصانیف میں اپنے استاد کے اقوال کی تائید کرتے ہیں اور آن کا نام نہایت احترام سے شیخ الاسلام کے لقب سے لیتے ہیں ۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد آن کی کتابوں کی تہذیب و ترتیب اور نشر و اشاعت آپ ہی کی بدولت ہوئی ۔

نصرت حق کی تائید میں شیخ کی طرح آپ کو بھی ایذاء دی گئی ۔ ۷۲۶ھ میں جب ابن تیمیہ کو طلاق اور شد رحال کے مسائل کے بارے میں فتووں کی بنا پر دمشق کے قلعے میں قید کیا گیا تو آن کے شاگردوں کو بھی قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں ۔ حافظ ابن القیم چونکہ امام موصوف کے خاص الخاص شاگرد تھے اس لیے آن کو خاص طور پر نشانہ ستم بنایا گیا ۔ آپ کو دروں کے ساتھ پیٹا گیا اور اس کے بعد اونٹ پر سوار کر کے سارے شہر میں مشتہر کیا گیا اور پھر قلعہ دمشق میں قید کر دیا گیا ۔ آپ نے قید و بند کی میعاد قرآن پاک کے تدبر و تفکر میں گزاری ۔ اسی قید خانے میں اہل معارف کے علوم و حقائق اور غیبی فیضان کے دروازے آپ پر کھل گئے اور صحیح وجدان اور ذوق سلیم کی دولت آپ کو عطا ہوئی ۔ آپ قرآن مجید بار بار پڑھتے اور آیات قرآنی پر غور کرتے ۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ مجھے قید کرنے والوں پر خدا رحم کرے اگر میں باہر ہوتا تو قرآن کو اس قدر نہ سمجھ سکتا ۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد آپ کو قید سے رہائی نصیب ہوئی لیکن مسلک ابن تیمیہ کی حمائت میں آپ کو پھر پہلے سے حالات سے دوچار ہونا پڑا ۔

آپ کے شاگرد ابن رجب فرماتے ہیں کہ میں نے عظیم علمی شخصیتوں کو آپ کے حضور میں با ادب بیٹھے دیکھا ۔ آپ کے تبحر علمی سے وقت کے بڑے بڑے علماء بھی مرعوب تھے فتاویٰ میں آن کی رائے آخری سمجھی جاتی تھی ۔ قاضی برھان الدین الذرعی اور ابن عبدالھادی ایسے علم و فضل کے مالک لوگ آن کے شاگرد تھے ۔ برہان الدین الذرعی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :

ما تحت ادیم السماء اوسع منه علما.

ابن کثیر فرماتے ہیں :

و کنت من اصحب الناس له واحب الناس الیه ولا نعرف فی هذا العالم فی زماننا اکثر عبادة منه . . . و کان حسن القراءة و الخلق کثیر التعدد لا یحسد احدا ولا یؤذیه ولا یستعیه ولا یحقد علی احد.

عبدالحی ابن العماد شذرات الذھب میں آپ کو المجتھد المطلق کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ اجتھاد کی جملہ شرائط آپ کی ذات میں پوری تھیں اس لیے آپ کو کسی امام کی تقلید کی ضرورت نہیں تھی ۔ بایں ہمہ آپ نے شیخ امام ابن تیمیہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا بلکہ تمام عمر مسلک ابن تیمیہ کی تائید و حمائت میں صرف کی ۔

البتہ تصنیف و تالیف کے میدان میں ابن القیم اپنے شیخ و استاذ ابن تیمیہ پر بلا شبہ فوقیت رکھتے ہیں اور اصابت اسلوب ، الفاظ و معانی ، دلائل کی منطقی ترتیب اور سلامت تعبیر میں آپ کی کتابیں ابن تیمیہ کی مصنفات پر فائق ہیں ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ابن تیمیہ نے اپنی اکثر تصنیفات جیل کی چار دیواری میں پریشان حالی میں تحریر کیں ۔ آپ کے مخالفین نے لمحہ بھر کے لیے بھی آپ کو اطمینان کا سانس نہ لینے دیا ۔ اس کے برعکس امام ابن القیم کو شیخ کی وفات کے بعد اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع مل گیا ۔ آپ کی ضخیم اور اہم کتابیں اسی دور میں مکمل ہوئیں ۔

امام ابن القیم کے سیاسی، علمی اور دینی ماحول اور ان کے حالات زندگی کے اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم اس قابل ہیں کہ تعمیر و استحکام خودی کے سلسلے میں ان کی خدمات کا جائزہ لیں جن کا ان کے ماحول پر براہ راست اور ان کے بعد تاریخ اسلام کے جملہ ادوار پر بالواسطہ بہت گہرا اثر پڑا اور وہ اثرات اب تک قائم و دائم ہیں ۔

اسلام دین توحید ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کا خلاصہ عقیدۂ توحید ہے ۔ جس طرح اللہ تعالی کی ذات میں کوئی شریک نہیں اسی طرح وہ اپنی

صفات میں بھی بے ہمتا ہے - یہی وہ عقیدہ ہے جس کی طرف آنحضرتؐ نے دعوت دی اور بعد میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ دینؒ بھی اسی عقیدے کے مبلغ رہے لیکن غیرمسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط، اسمٰعیلی اور باطنی حکومت کے اثر و نفوذ اور جاہل صوفیوں کی تعلیم و عمل سے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم و عقائد کا رواج ہو گیا - مشرکانہ رسوم و عقائد مثلاً اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اللہ کے علاوہ دوسروں کو حاجت روا اور مشکل کشا ماننا، مصائب و آلام میں ان کی طرف رجوع کرنا اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی دہائی دینا اور ان کی خوشنودی کے لیے منتیں ماننا اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ خودی اور انسانی عظمت کے تصور کے بھی خلاف ہے - یہ ان اسباب میں سے ہے جن کی بنا پر خودی ضعیف ہو کر رہ جاتی ہے - جو قوم مشرکانہ معتقدات کا شکار ہو جائے اسے ہمیشہ غیر اللہ کا خوف دامنگیر رہے گا - جن کی بناء پر اس میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکے گی - نتیجتاً وہ کبھی بھی مضبوط قوم کی حیثیت سے شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکے گی -

ابن قیم الجوزیہ نے اپنے دور کے عوام کے ان مشرکانہ رجحانات کا بڑی سختی کے ساتھ نوٹس لیا اور ان کی واضح اور واشگاف الفاظ میں تکذیب و تردید کی - مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف اس جہاد میں آپ نے عوام کی رضامندی یا ناراضی اور حکمرانوں کے قہر و عتاب یا خوشنودی کی قطعاً کوئی پروا نہیں کی اور اس طرح عقیدۂ توحید کی تجدید و احیاء اور تصور خودی کی تعمیر و استحکام میں عدیم النظیر خدمات انجام دیں - آپ نے ان عقائد و تصورات کی بھی تردید کی جو اس مشرکانہ طرز عمل کی بنیاد تھے -

امام ابن القیم نے اپنی مختلف تصنیفات میں عقیدۂ توحید کی عظمت، اس کی برکات اور شرک کی نجاست اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں کا مفصل ذکر کیا ہے - اغاثۃ اللھفان من مصائد الشیطان میں لکھتے ہیں: توحید کا مطلب صرف توحید ربوبیت کا ماننا نہیں، خداوند تعالی کے رب ہونے کو تو مسلم اور کافر سب مانتے ہیں - توحید کا اصل مطلب توحید الوہیت ہے - اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی کا بندوں پر حق ہے کہ وہ سب اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی اور شریک نہ بنائیں - اگر کسی کے دل میں اللہ کے علاوہ کسی اور کا خیال تک بھی ہو تو وہ ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے گا جس سے شفاء کی امید نہیں کی جا سکتی - اگر کسی کو کسی معبود باطل کی عبادت سے کوئی وقتی فائدہ بھی حاصل ہو جائے تو اس کا ضرر فائدہ سے کہیں زیادہ ہوگا - یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص زہر آلود کھانا خوش ہو کر اور چٹخارے لے کر کھائے - اگر کوئی

شخص اللہ کو چھوڑ کر مخلوق پر اعتماد اور توکل کرے گا تو اسے سوائے ضرر اور نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کارخانہ قدرت کو چلانے کے لیے اکیلا کافی نہیں۔ اسے وزراء، اعیان اور مددگاروں کی ضرورت ہے۔ اس ہستی کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے جو جملہ اعیان و انصار سے مستغنی ہے اور دوسرے سب اس کے در کے فقیر ہیں۔ جو لوگ مخلوق کی شفاعت اور وسیلے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکنے کا غلط عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت میں نقص نکالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کو پامال کرتے ہیں ہستی باری تعالیٰ کی اس توہین کی بناء پر ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ مشرک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الیم میں مبتلا رہے گا۔ جس طرح مشرک اللہ تعالیٰ کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے اسی طرح بدعتی آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں گروہوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی شان بڑھانے والے ہیں۔

جب انسان توحید خالص کا اقرار کرکے اس پر عمل پیرا ہو جائے تو وہ جملہ گناہوں، کوتاہیوں اور لغزشوں سے بچ جاتا ہے کیونکہ توحید کا مطلب اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرنا، صرف اس سے ڈرنا اور صرف اس سے امید رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق گناہوں کو دھو ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ گناہوں کی عارضی نجاست اس مضبوط عقیدے کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن مشرک گناہوں کی نجاست سے نہیں بچ سکتا۔ مشرک میں جتنا شرک زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ گناہوں سے زیادہ آلودہ ہوگا۔

عقیدہ توحید کی عظمت کے بیان اور عوام الناس میں رائج مشرکانہ رسوم و عقائد پر تنقید کے ساتھ ساتھ ابن القیم نے اپنے دور کے صوفیا کے خلاف شریعت و سنت معتقدات پر بھی شدید نکتہ چینی کی۔ صوفیا میں ان کا شدید ترین اختلاف اپنے شیخ و استاذ ابن تیمیہ کی طرح ایسے لوگوں سے تھا جو نظریہ وحدۃ الوجوۃ کے حامی تھے اسی سلسلے میں انھوں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، شیخ عمر بن الفارض، شیخ علی الحریری، شیخ نجم الدین بن اسرائیل، شیخ عبدالحق ابن سبعین، شیخ صدرالدین قونوی اور شیخ عفیف الدین تلمسانی کے عقائد و خیالات پر شدید تنقید کی ہے۔ ابن القیم عقیدہ وحدۃ الوجود کو خلاف شریعت قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق وجود قدیم خالق اور وجود حادث مخلوق کے مابین کوئی امتیاز نہیں رہ جاتا اس عقیدے کے مطابق رب اور عبد، مالک اور مملوک، راحم اور مرحوم، عابد اور معبود اور مستعین اور مستعان سب ایک ہیں۔ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طاعت و معصیت کے مابین فرق ختم ہو جاتا ہے۔ جب مطیع عین مطاع ہو تو پھر

طاعت و معصیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

ابن القیم نے صوفیہ کے اس عقیدے پر بھی تنقید کی ہے کہ جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے تو اس سے فرائض و تکلیفات شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں اور اس کے لیے محرمات حلال ہو جاتی ہیں۔ ابن القیم فرائض شرعیہ سے فرار کو کفر اور انسلاخ عن الدین قرار دیتے ہیں۔ آدمی خواہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ اور مقام میں کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو اس سے تکالیف شریعت مثلاً نماز، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ساقط نہیں ہوتیں۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے جوں جوں بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے وہ اللہ کے اوامر و نواہی کا زیادہ خیال کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی سے یہی بات واضح ہوتی ہے اور صاحب علم صوفیا نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

بعض صوفی حقیقت اور شریعت کے مابین فرق کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق شریعت عوام الناس کے لیے اور طریقت خواص کے لیے ہے۔ ابن القیم نے اس عقیدے پر بھی بہت کڑی تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ شریعت اور حقیقت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ شریعت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ عبادت کے دوران اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ شریعت اللہ کے احکام پر عمل اور طریقت اس کی صفات کمال اور نعوت جلال کا مشاہدہ ہے۔ کوئی علم لدنی شریعت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے لدنی اور الہامی علم کا دعویٰ کرے تو یہ الہام اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں بلکہ اس کی اپنی خواہشات کی جانب سے ہوگا۔

ابن القیم کے دور کے بعض صوفیا علم شریعت کے حصول کو غیرضروری سمجھتے اور وجد و کشف اور ذوق کو زیادہ اہمیت دیتے اور کہتے العلم حجاب بین القلب و بین اللہ۔ ابن القیم نے صوفیا کے اس غلط عقیدے کی بھی تردید کی اور لکھا جو صوفی یہ خیال کرتا ہو کہ وہ اپنے وساوس و ہواجس کی بناء پر آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہونے والے علم سے مستغنی ہو سکتا ہے اس سے زیادہ گمراہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کشف اور وجدان اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ ایسا القا القاء عن النفس ہوگا، اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہوگا۔

اب ہم ایک اور اہم مسئلے پر گفتگو کریں گے جس کا خودی کی تعمیر، تربیت اور استحکام کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔ میری مراد مسئلہ تقلید و اجتہاد ہے، تقلید سے مراد کسی دوسرے کے اقوال و اعمال کو بغیر دلیل معلوم کیے بغیر اس کا تجزیہ کیے آنکھیں بند کر کے صحیح سمجھ کر اختیار کر لینا ہے۔ اجتہاد تقلید کی ضد ہے۔ ظاہر ہے کسی کی اندھا دھند پیروی سے خودی پروان نہیں چڑھتی بلکہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ فقہی اور فکری جمود کو توڑنے اور

حریت فکر کے دریچے وا کرنے میں ابن القیم نے اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ دور حاضر کے بعض مجتہدین نے تو اپنے نظریات براہ راست ابن القیم اور آن کے شیخ سے اخذ کیے ہیں۔ ہمارے پاس اسلامی فقہ کی تدوین کے مختلف ادوار تقلید کے ظہور اور آس کے اسباب اور تقلید کے لوگوں کے رگ و ریشے میں سرائت کر جانے کے بارے میں مفصل گفتگو کرنے کے لیے وقت نہیں مختصر یہ کہ تاتاریوں کے ہاتھوں اسلام کے عظیم علمی مراکز کی بربادی اور علماء کے قتل عام کے بعد عالم اسلام پر جو عالمگیر فکری انحطاط اور علمی زوال شروع ہوا اور ایسی بلند شخصیتیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتی ہوں ناپید ہونے لگیں تو اس میں عافیت سمجھی جانے لگی کہ جن مذاہب کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ثابت ہے آن پر عمل کیا جائے۔ لیکن رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا اور ائمہ کی حیثیت وسائل کی بجائے مقصود اور شارع اور مطاع کی ہو گئی اور لوگوں میں ان مذاہب سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ وہ کسی حال میں آن کے ایک شوشے تک سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ عوام الناس تو ایسا کرنے پر قابل الزام نہیں بعض علماء کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر ان کو اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث و سنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور آس کا قطعی علم ہو جائے کہ اس مسئلے میں آن کے اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام کا مذہب یا مسئلہ راجح ہے اور حدیث و سنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح احادیث کیوں نہ ملیں تب بھی وہ اس مسئلے کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ ابو الحسن عبداللہ الکرخی نے ایک مرتبہ کہا: کل اٰیة تخالف ما علیه اصحابنا فهی مؤولة اومنسوخة و کل حدیث کذلک مؤول ام منسوخ.

ابن القیم اس طرح کی تقلید کو جہاں دلیل کی بجائے افراد کی پیروی کی جائے اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ وہ تقلید اعمیٰ کے مخالف اور آزادی فکر اور اجتہاد کے علمبردار تھے۔ فقہاء کا جمود آنہیں سخت ناپسند تھا۔ وہ مقلد کو علماء کے زمرے میں شمار نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ بقول آن کے علم سے مراد وہ معرفت ہے جو دلیل کے ذریعے حاصل ہوئی ہو۔ دلیل کے بغیر جو کچھ حاصل ہو وہ صرف تقلید ہے۔ علامہ ابن خلدون نے بھی مقدمہ میں ان ہی نظریات کا اظہار کیا ہے۔

اپنے دور میں تقلید کی گرم بازاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تالله انها فتنة عمت فاعمت ورمت القلوب فأصمت ، ربا علیها الصغیر وهرم فیها لکبیر واتخذ لاجلها القرآن مهجوراً۔

ابن القیم اندھا دھند تقلید کو قرآن و سنت کے انکار کے مصداق قرار دیتے ہیں اور ہر دور میں ہر سوسائٹی کے لیے اجتہاد کو لازم قرار دیتے ہیں کیونکہ زندگی

کے احوال و ظروف بدل رہے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں قرآن و حدیث کی روشنی میں جدید مسائل کا حل تلاش کرنا انسانی زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہے ۔ وہ اس سلسلے میں ائمہ عظام کے درج ذیل اقوال پیش کرتے ہیں :

امام شافعیؒ نے فرمایا : مثل الذی یطلب العلم بلا حجة کمثل حاطب لیل یحصل حزمة و فیه افعی تلدغه و هو لایدری ۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے: لا تقلدونی ولا مالکا ولا الثوری ولا الاوزاعی خذوا من حیث أخذوا.

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے : لایحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا ۔

امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے: علمنا هذا رأی وهو أحسن ما قدرنا علیه و من جاءنا بأحسن منه قبلنا منه ۔

امام مالکؒ کا قول ہے : ایضا انا بشر اخطی وأصیب فانظروا فی قولی فکل ماوافق الکتاب والسنة فخذوه ومالم یوافق الکتاب و السنة فاترکوه.

امام ابن القیم کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح کتاب و سنت کو عقائد کا ماخذ بنانے کی پرزور دعوت دی اور خود کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا اسی طرح کتاب و سنت کو فقہیات و احکام کا ماخذ بنانے اور آن کو حق کا معیار قرار دینے کی طاقتور دعوت دی اور اپنے زمانے میں آس پر عمل کرکے دکھایا ۔ آن کی اس دعوت نے ان فقہی دائروں اور امت کے علمی حلقوں میں جن میں عرصہ سے نئے غور و فکر اور احکام و مسائل کے کتاب و سنت سے مقابلے کا کام بند ہو گیا تھا اور اجتہاد و استنباط کا سلسلہ عرصہ سے مسدود تھا نئی علمی و فکری حرکت اور براہ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کی تحریک پیدا ہوئی اور اس طرح انھوں نے آس صحیح اسلامی فکر کا احیاء کیا جو قرون اولیٰ میں پائی جاتی تھی۔

تعمیر و استحکام خودی کے سلسلے میں ابن القیم کی ایک خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی فرق باطلہ مثلاً جہمیہ یا معطلہ ، مشبہ ، جبریہ ، قدریہ ، معتزلہ ، فلاسفہ وغیرہ کی پرزور تردید کی اور ان کے اعتقادات کے رد میں مستقل کتابیں تحریر کیں ۔ ان فرقوں کی تردید میں آن کی القصیدة النونیه فی التوحید و الفقہ ، اجتماع الجیوش الاسلامیه ، شفاء العلیل فی مسائل القضاء و القدر و الحکمة و التعلیل ، الصواعق المنزلة علی الجهمیه و المعطله وغیرہ بہت اہمیت کی حامل ہیں ۔ آپ نے عیسائیت اور یہودیت کی پرزور اور مدلل تردید کی اور اسلام کے بارے میں عیسائیوں اور یہودیوں کی الزام تراشیوں کا شافی جواب دیا ۔ آپ کی هدایة الحیاری

فی اجوبة الیهود و النصاری اور جواب عابدی الصلبان و ان ما هم علیه دین الشیطان کے نام سے یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں مستقل اور ضخیم کتابیں تحریر کیں۔

آپ اپنے اُستاد کی طرح فلسفہ اور علم کلام کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ سابقہ متکلمین فلسفہ یونان سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ اُنھیں اکثر مقامات پر یونانی فلسفہ کی خاطر نصوص کتاب و سنت کی غلط اور فاسد تاویل کرنا پڑی لیکن ابن القیم اور اُن کے اُستاد ابن تیمیہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُنھوں نے فلسفہ و منطق اور علم کلام کی مفصل تنقید کا فرض انجام دیا اور اُن کے مقابلے میں مدلل طریقہ پر کتاب و سنت کے طرز و اُسلوب کی برتری ثابت کی اور عقائد کا ماخذ قرآن و سنت کو قرار دیا۔ آپ نے اہم کلامی مسائل مثلاً وجود باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ، جبر و قدر یعنی افعال العباد، رویة الله اور حسن و قبح وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے اُسی طریق استدلال کو اختیار کیا ہے جو قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے۔ آپ نے اسی طریق استدلال کی برتری اور فلاسفہ و متکلمین کے طریق استدلال کے غلط ہونے پر مفصل بحث کی ہے۔ اُن کو متکلمین و فلاسفہ کے اسی دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا صحیفہ ہے جس کی بنیاد محض نقلیات و سمعیات پر ہے، اُنھوں نے جابجا ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں بہترین عقلی دلائل موجود ہیں اور یہ دلائل ایسے محکم، مدلل اور واضح الثبوت ہیں جن کو فلاسفہ اور متکلمین کے دلائل نہیں پہنچ سکتے۔ فلاسفہ اور متکلمین اور اُن کے ہمنواؤں کے گروہ میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ رسول الله صلی الله علیه وسلم نے ذات و صفات کے بارے میں پوری تفصیل سے کام نہیں لیا ان چیزوں کو مجمل و مبہم بیان کیا ہے آپ لکھتے ہیں کہ رسول الله صلی الله علیه وسلم کو بلاغ مبین کا حکم ہوا تھا اور آپ نے ہر اُس چیز کی تفصیل و تشریح کی جس کی تفصیل و تشریح دین کے لیے ضروری تھی۔ عقاید و اصول دین کی بنیادیں اور خدا کی ذات و صفات جس کے بغیر معرفت اور انسان کی نجات ممکن نہیں کیسے مجمل و مبہم چھوڑے جا سکتے ہیں۔ آنحضور صلی الله علیه وسلم نے تبلیغ کا حق ادا کیا اور مکمل اور واضح طور پر خدا کی بات پہنچائی۔

دعوت عامہ امت، تجدید شریعت، احیاء سنت بعد موتها اور اخماد بدعت بعد شیوعها و نفوذها کے سلسلے میں ابن القیم کی خدمات سے امت مرحومہ کی انفرادی و اجتماعی خودی کی تعمیر و استحکام کا عمل بہت متاثر ہوا، تاتاریوں کی عین جالوت کے مقام پر عبرتناک شکست، الملک الظاہر بیبرس کا صلیبیوں کو اسلامی علاقوں خصوصاً شام و بیروت سے بیک بینی و دو گوش نکال کر سمندر میں پھینک دینا،

فکر اسلامی کا احیاء ، علوم شریعت کی تجدید اور جملہ مسائل و امور میں کتاب و سنت کی طرف رجوع اور فلسفہ و منطق یونان سے بے زاری اس عظیم تحریک ہی کی بنا پر ممکن ہوئی جس کی داغ بیل وقت کے عظیم ترین عالم ابن تیمیہ نے ڈالی تھی اور جس کی آبیاری ابن القیم اور ابن تیمیہ کے دیگر شاگردوں مثلاً ابن الھادی ، ابن کثیر حافظ ذہبی ، ابن الوردی قاضی ابن فضل اللہ وغیرہ نے کی تھی۔ بعد کے تقریباً ہر دور میں ہمیں ایسے افراد کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں جو اس تحریک سے متاثر ہوئے اور جنھوں نے شیخین یعنی ابن تیمیہ اور ابن القیم کے علمی ورثے سے استفادہ کیا اور جو ان کی گراں بہا اسلامی خدمات اور اس راہ میں ان کی ناقابل فراموش جد و جہد کے اعتراف اور انھیں اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔

برصغیر ہند و پاک آٹھویں صدی ہی میں اس تحریک سے فیضیاب ہو گیا تھا ۔ چنانچہ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی مرحوم لکھتے ہیں ، مولانا شمس الدین الحریری جو مصر کے حنفی قاضی تھے اور امام ابن تیمیہ کی حمایت کے سبب اس عہدے سے معزول کر دیے گئے ۔ ۷۰۸ھ میں سلطان علاءالدین خلجی کے دور میں ہندوستان آئے اور حدیث کی چار سو کتابیں ساتھ لائے ۔ غالباً یہ سب سے قابل ذکر ذخیرہ حدیث ہے جو ہندوستان آیا ۔ مولانا علم الدین نبیرہ حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی حضرت امام ابن تیمیہ کے صحبت یافتہ تھے اور سلطان محمد بن تغلق کو بدعات و اوہام پرستی کے قلع قمع پر آمادہ کرنے والے شخص تھے۔ شیخ الاسلام کے ایک شاگرد علامہ عبدالعزیز اردبیلی بھی دمشق سے سلطان محمد تغلق کے دربار میں آئے تھے ۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں زیارت قبور ، سماع، تصور ولائت ، خانقاہی نظام وغیرہ پر ابن تیمیہ کے خیالات سے غالباً محمد بن تغلق متاثر ہوا ۔ اس نے اپنے دور حکومت میں اصلاح کی کوششیں کیں وہ امام ابن تیمیہ کی تحریک اور تصورات سے بہت مشابہت رکھی ہیں ۔

بارھویں صدی ہجری کے وسط میں جب شاہ ولی اللہ دہلوی تحصیل علم حدیث کے لیے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بقول مولانا ابو الکلام آزاد ابن تیمیہ اور ابن القیم دونوں کی کتابیں شیخ ابراہیم کورانی متوفی ۱۰۱۰ھ کی وسعت نظری و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعہ میں آئیں۔ اسی مطالعہ کی جھلک شاہ صاحب کی تصانیف میں صاف نظر آتی ہے حجۃ اللہ البالغہ مبحث سابع ص ۱۵۹ ج اول طبع مصر میں تو ایک جگہ عبارتیں تک شیخ الاسلام کے فتاوی ص ۲۸۵، ج ۲ کی ہیں ۔

دور حاضر کی اسلامی تحریکیں بھی ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن القیم کے افکار و نظریات سے بہت متاثر ہوئیں ۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی شیخ محمد بن علی السنوسی ، مصر کے مبلغین اور برصغیر پاک و ہند کے اہل حدیث اور ان

کے علاوہ رجوع الی الکتاب والسنۃ اور اجتہاد آزادی فکر کے علمبردار جہاں کہیں بھی ہیں ابن تیمیہ اور ابن القیم کی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب پر ابن تیمیہ کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ احمد امین اپنی کتاب زعماء الاصلاح میں لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالوہاب نے ابن تیمیہ کا ایک رسالہ اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا جو اب لنڈن کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

کتاب و سنت کی طرف رجوع اور اتحاد شرکت و بدعت اور تعمیر و استحکام خودی کی یہ مضبوط تحریک آج بھی لوگوں پر گہرا اثر ڈال رہی ہے۔